عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی!!

إدارۂ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماھنامہ غزالی

جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ/جولائی 2005ء

Reg No: P 476

جلد سوم : شمارہ :11

فہرست

عنوان	صاحب مضمون	صفحہ نمبر
تصوف کی ضرورت و حقیقت (قسط:'۲')	مولانا عبدالحفیظ مکی مدظلہٗ	۳
اعتراف	عبدالغفور صاحب لائبریرین K.M.C	۹
اہلِ سنت والجماعت (قسط نمبر:'۴')	علامہ سید سلیمان ندویؒ	۱۱
اصلاحی مجلس	ڈاکٹر فدا محمد مدظلہٗ	۱۵
نوشتۂ دیوار	ڈاکٹر طارق علی	۲۲
خرقِ عادت اور معجزات انبیاء	انتخاب از سیرتِ کبریٰ	۲۳
تبصرۂ کتب	ڈاکٹر فدا محمد مدظلہٗ	۳۰
خواب اور پیغام	انتخاب از ماہنامہ بینات (مئی ۱۹۷۲)	۳۲

فی شمارہ : 15روپے

سالانہ بدل اشتراک :180روپے

خط و کتابت کا پتہ : مدیر ماہنامہ غزالی

مکان نمبر: P-12

یونیورسٹی کیمپس، پشاور

ای میل :>>>> saqipak99@gmail.com

saqi_pak99@yahoo.com

عبد الحفیظ مکی مدظلہ

﴿تصوف کی ضرورت و حقیقت﴾ (قسط : ۲)

بعض عارفین کا قول ہے فرماتے ہیں:

وَاللّٰہِ لَوْ عَلِمَ الْمُلُوکُ ، وَاَبْنَاءُ الْمُلُوکِ مَانَحْنُ فِیْہِ لَبَارَزُوْنَ عَلَیْہِ بِالسُّیُوفِ

ترجمہ: ''خدا کی قسم اگر بادشاہوں کو اور شہزادوں کو اس حقیقت کا پتہ چل جائے کہ ہمیں اللہ کی عبادت اللہ کی معرفت اور اللہ کی اطاعت میں کتنا لطف اور مزہ آتا ہے تو وہ تلواریں سونت کر آجائیں اور ہم سے لڑائی کریں، جنگ کریں کہ یہ لطف تو ہمیں دے دو۔''

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ عجیب بات فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے تزکیۂ نفس نہ کرایا ہو اور جن کے دل اللہ کے نور سے منور نہ ہوئے ہوں اُن کو کیسے بتایا جائے کہ یہ مزہ کیسا ہے؟ سمجھنا بھی تو ایک مسئلہ ہے ناں! اور اسکی مثال یوں دیتے ہیں جیسے کسی طفل کو، کسی بچے کو، جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو اس کو بلوغت کی بعد کی باتیں سمجھانا چاہیں، نہیں سمجھائی جاسکتیں، نابالغ بچے کو جو سات آٹھ سال کا ہو اسے کہاں ہم بلوغت کی بعد کی باتیں سمجھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ مزہ اپنی عبادت، اپنی معرفت میں رکھا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ بہت سے لوگ اس دُنیا سے چلے جاتے ہیں حالانکہ حال اُن کا یہ ہوتا ہے کہ ﴿ لَمْ یَذُوقُوْ اَلَذَّ مَا فِیْھَا ﴾ کہ جو اللہ نے سب سے لذیذ ترین چیز دنیا میں بنائی ہے وہ انھوں نے چکھی تک نہیں۔ کسی نے کہا حضرت وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا وہ اللہ کی معرفت ہے۔ وہ کب حاصل ہوتی ہے؟...... جب پہلے تزکیۂ نفس کرا کے دل کو گندگیوں سے، رذائل سے پاک و صاف کر کے اللہ کے نور سے منور ہونے کے قابل بنا لے۔ جب دل اللہ کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے، ایک نوجوان صحابی حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ مسجد میں سو رہے تھے، نوجوان صحابی تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاؤں مبارک کے انگوٹھے سے اُنھیں ہلایا...... یہ محبت کی بات ہے، کہتے ہیں جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تکلف نہیں ہوتا ...... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تکلفی سے محبت میں انگوٹھے سے اُن کو ہلایا، وہ اُٹھے اور ہشاش بشاش ہو گئے، اور انھیں کیا چاہئے تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سامنے ہیں، اُٹھے اور سلام کیا۔ اب یہ دیکھئے سو کے اُٹھنے والے آدمی نے بات چیت کی کچھ تیاری نہیں کی ہوتی، کوئی اسکیم نہیں بنائی ہوتی، سیدھی سیدھی بات جو دل میں ہے وہی کہتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا:

﴿ کَیفَ اَصبَحتَ یَا حَارِثَۃُ ﴾ اے حارث تم نے کس حال میں صبح کی؟ اُنھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ﴿اَصبحتُ مُؤمِناً حقًّا یارَسُولَ اللّٰہ﴾ کہ میں نے پختہ حقیقی ایمان کی حالت میں صبح کی۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر قول کی ایک حقیقت ہوتی ہے، ہر بات کی کوئی دلیل ہوتی ہے، تو اس قول کی جو تم اتنا بڑا دعویٰ کر رہے ہو کیا حقیقت ہے؟ ﴿ فَمَا حَقِیقَۃُ مَا تَقُولُ ﴾ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ﴿حَذَفتُ نَفسِی عَنِ الدُّنیَا ﴾ کہ دُنیا سے میرا دل مُڑ چکا ہے، اور میں نے اپنے دِنوں کو بھوکا کر دیا، پیاسا کر دیا، دِنوں کو تو میں نے پیاسا کر دیا اور راتوں کو جگا دیا۔ دِن کو پیاسا رہتا ہوں یعنی روزہ رکھتا ہوں کہ یہ وقت کیوں ضائع جائے، میں ایسا عمل کروں کہ میرا مولا مجھ سے راضی ہو، اور راتوں کو پوری رات اللہ کے لیے جاگتا ہوں۔ کبھی نماز، کبھی دُعاء، کبھی استغفار، کبھی ذِکر، کبھی دُعائیں کبھی رونا دھونا، بس اس میں لگا رہتا ہوں۔ یہ تو ہے میرے عمل کی حالت، اور یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری قلب کی کیفیت اور دل کی حالت یہ ہے ﴿کَاَنِّی اَرَا عَرشَ رَبِّی﴾، جیسے میں اپنے رب کے عرش کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں ﴿وَ کَانِّی اَرَا اَھلَ الجَنَّۃِ فِیھَا یَتزَاوَرُونَ وَ اَھلَ النَّارِ فِیھَا یَتعَاوُنَ﴾، گویا میں اپنے سامنے جنت والوں کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک دوسرے سے ملاقات کر رہے ہیں اور جہنم والوں کو بھی میں اپنے سامنے پاتا ہوں کہ وہ چیخ چیخ کر کتوں کی طرح بھونک رہیں ہیں۔

اور دوسری روایت میں مزید اضافہ ہے کہ میں جب بھی کوئی قدم اُٹھاتا ہوں ﴿رَأَیتُ جَنَّۃَ عَن یَمِینِی وَالنَّارَ عَن شِمَالِی ﴾، دیکھتا ہوں جنت میری دائیں طرف ہے جہنم میری بائیں طرف ہے۔ تو ہر قدم اُٹھانے سے پہلے، ہر عمل کرنے سے پہلے ﴿حَاسَبتُ نَفسِی ھَل اِلٰی ھٰذِہٖ اَم اِلٰی ھٰذِہٖ﴾ میں اپنے نفس سے پوچھتا ہوں کہ یہ عمل، یہ قدم جو میں اُٹھا رہا ہوں، یہ عمل جو میں کر رہا ہوں یہ مجھے کدھر لے جائے گا؟ اس طرف یا اُس طرف؟ جب انھوں نے یہ بات کہی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿یَاحَارِثَۃ أَنتَ مَرءٌ نَوَّرَ اللّٰہُ قَلبَکَ ﴾، اے حارثہ! تم ایسے شخص ہو جس کے دل کو اللہ نے روشن و منور کر دیا، ﴿عَرفتَ فَلزَم﴾، تم سمجھ گئے ہو، صوفیاء کی اصطلاح میں تمھیں معرفت حاصل ہو گئی ہے، اسے مضبوط پکڑنا، پھر بس یہی صحیح راستہ ہے۔ یہ صحابی حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ، ان کے نام میں محدثین میں اختلاف ہے کہ نام حارثہ ہے کہ حارث ہے، پھر ولدیت میں اختلاف ہے کہ ان کے باپ کون ہیں؟ بعض کہتے ہیں فلاں ہے بعض کہتے ہیں فلاں ہے۔ میرا عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے نوجوان اور عام صحابی ہیں جن کے نام میں

بھی اختلاف ہے، گویا مشہور نہیں تھے، نہ لوگوں میں نہ محدثین کے ہاں، اور کوئی حدیث بھی ان سے روایت نہیں، نہ انکی ولدیت کا کسی کو صحیح پتہ ہے، ایسے صحابی کا یہ حال تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گواہی دے رہیں ہیں کہ تیرے دل کو اللہ نے منور اور روشن کر دیا، تمھیں معرفت حاصل ہوگئی، تم صحیح رُخ پر جا رہے ہو، اسی پر ڈٹے رہو، اسی پر جمے رہو۔

اس سے اندازہ کریں کہ جب ایک عام صحابی کا یہ حال تھا تو پھر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا کیا حال ہوگا، اُن کی قلبی کیفیت کیا ہوگی۔ ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے، جبکہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی رضی اللہ عنہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے ساتھ پہلی ہی نظر ڈالتے تھے تو صوفیاء کرام کا اتفاق ہے کہ انکو احسان کی کیفیت حاصل ہو جاتی تھی۔ ایک نظر سے ہی سارا تزکیہ ہو جاتا تھا، قلب میں جتنی گندگیاں ہیں یہ سب پاک صاف ہو جاتی تھیں اور وَیُزَکِّیْھِمْ کا مصداق ہو جاتا تھا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارِ نبوت سے اُن کا دل منور اور روشن ہو جاتا تھا۔

دِین کی یہ چیزیں وہیں سے چلی آرہی ہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بے شمار واقعات ہیں کہ کیا انکا عالم تھا، پھر تابعین کے دور میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حافظ ذہبی ابن اعرابیؒ کے حوالے سے اپنی کتاب میں نقل فرماتے ہیں...... حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا کبار تابعین میں شمار ہوتا ہے، آپ علمِ حدیث، علمِ تفسیر اور اولیاء اللہ کے امام ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھٹے سال میں ان کی پیدائش ہوئی، مدینہ منورہ کی گلیوں میں صحابہ کے درمیان اُن کی پرورش ہوئی (حضرت فرید الدین عطارؒ کی تذکرۃ الاولیاء کے مطابق دو سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ ادارہ)...... ان کے بارے میں حافظ ذہبیؒ نقل کرتے ہیں کہ انکا ایک درس تو ہوتا تھا مسجد میں، تفسیر کا پھر حدیث کا درس ہوتا تھا، پھر وعظ و نصیحت وغیرہ کا ہوتا تھا یہ تو مسجد میں ہوتے تھے، اور ایک ان کی مجلس ان کے گھر میں لگا کرتی تھی، اس تابعین کے زمانے میں ﴿لَا یَجْتَمِعُ اِلَیْہِ فِیْہِ اِلَّا خَاصَۃُ اَصْحَابِہٖ﴾، اُس مجلس میں خاص خاص بزرگ اور خاص خاص شاگرد و تلامذہ ہی بیٹھتے تھے، عوام کو اس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی، اس میں بھی بڑے اکابر اہل اللہ کا ذکر ہے جیسے عبدالواحد ابن زید اور حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ یہ حضرات بیٹھا کرتے تھے، اور اس میں صرف اصلاحِ قلب اور تزکیۂ نفس کے بارے میں ہی گفتگو ہوتی تھی، حضرت اسی کے بارے میں لوگوں کو وعظ فرماتے تھے، نصیحت فرماتے تھے، کسی کو کوئی اشکال ہوتا تو اسکا جواب دیتے تھے، یہ اس

زمانے کی خانقاہ تھی۔ مستقل خانقاہ تو نہیں تھی، گھر میں خانقاہی مجلس ہوتی تھی۔ آگے عجیب بات حضرت فرماتے ہیں کہ اُس خاص مجلس میں اگر کوئی شخص تفسیر قرآن یا حدیث کی تشریح کے بارے میں کوئی سوال کرتا، تو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر غصے کے آثار ہوجاتے اور حدّت طاری ہوجاتی اور فرماتے کہ مسجد میں تم نے اس کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا، وہاں میں یہی تو کرتا رہا ہوں، یہاں تو میں اپنے خاص خاص ساتھیوں کے ساتھ خاص چیز کے بارے میں گفتگو کرنے بیٹھا ہوں۔ یہ تابعین کا دور ہے جس میں خانقاہی مجالس باقاعدہ لگا کرتی تھیں۔ میرا عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ خانقاہی لائن کوئی نئی چیز نہیں ہے، قرآن میں اسکی اہمیت ہے، سنت میں اہمیت ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسکو اہمیت دی۔

تابعین کے دور میں یہ مرحلہ آگیا کہ باقاعدہ اس کو مستقل حیثیت دی گئی، تفسیر، حدیث کی مجالس کے علاوہ باقاعدہ اس کے لیے علیحدہ مجالس مقرر کی گئیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جیسے ثقہ معتمد جن کی روایات صحاح ستہ میں ہیں اور محدثین وفقہا کے امام ہیں، اولیاء اللہ کے امام ہے، انکی باقاعدہ مجلس اسی سلسلے میں، اسی اصلاحِ باطنی، اصلاحِ قلب اور تزکیۂ نفس کے لیے لگا کرتی تھیں۔ پھر اگلے مرحلے میں تبع تابعین کے زمانے میں مستقل خانقاہیں بن گئیں۔ شیخ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے کئی مؤرخین نے یہ بات لکھی ہے کہ حضرت عبدالواحد ابن زید رحمۃ اللہ علیہ جو کہ خود بھی تابعی ہیں، ان کے اصحاب، ان کے تلامذہ ان کے مریدین وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے بصرہ میں باقاعدہ صوفیاء کے لیے ایک علیٰحدہ مکان بنایا۔ صوفیا کے لیے جو علیٰحدہ مکان بنے گا وہ خانقاہ ہی تو ہوگا۔ ہماری اصطلاح میں اس کو خانقاہ کہتے ہیں۔ اُس وقت سے لیکر آج تک مستقل خانقاہیں بننی شروع ہوگئیں، مدرسے بھی بننے شروع ہوگئے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پورے دور میں نہ تو ہمیں مدرسے کی علیٰحدہ عمارت مستقل ملتی ہے اور نہ خانقاہ کی علیٰحدہ مستقل عمارت ملتی ہے، ہاں تابعین کے آخری دور میں، تبع تابعین کے دور میں مختلف جگہوں پر مدارس کے لیے بھی مستقل عمارت بننی شروع ہوگئی اور بالکل اسی زمانے کے آس پاس مستقل خانقاہیں بھی بننی شروع ہوگئیں۔ اسی وقت سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔

حضرت عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ ہمیں ہمیشہ سنایا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے اکابر سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ دِین کے تین مراکز ہیں، مسجد، مدرسہ اور خانقاہ، یہ تینوں دِین کے مراکز ہیں۔ سلف کے زمانے سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں علم کی مجالس اور ذکر کی مجالس مسجدِ نبویؐ میں لگا کرتی

تھیں، اور علماء شراحِ حدیث فرماتے ہیں کہ یہ علم کی مجلس اور ذکر کی مجلس جو مسجد نبویؐ میں اس وقت لگا کرتی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی لگتی رہیں، یہ بنیادیں ہیں مدرسے اور خانقاہ کی۔ یہ تسلسل ہے جو چلا آرہا ہے، اس لیے علم کی بھی اسانید حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہیں۔ جب کوئی شخص حدیث سناتا ہے تو کہتا ہے میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی، اُنھوں نے فلاں سے سنی، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ سلسلہ جاتا ہے۔ یہی حال تصوف کا بھی ہے کہ ہر شخص اپنے شیخ کے بارے میں کہتا ہے کہ میرے شیخ فلاں، اُنکے شیخ فلاں اور اُنھوں نے فلاں سے سلوک طے کرایا، اُنھوں نے فلاں سے طے کرایا، حتیٰ کہ یہ سلسلہ تبع تابعین، تابعین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہوتا ہوا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مقصد نبوت تھیں اور دونوں آج تک چلی آرہی ہیں۔

اس لیے ہمارے تمام اکابر رحمۃ اللہ علیہ، چاہے حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہوں، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہوں، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی ہوں، محدثِ زمانہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ ہوں، حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوری ہوں، حضرت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہوں، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہوں، حضرت شیخ مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ ہوں، مولانا حبیب اللہ لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ ہوں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہوں، پاکستان میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ہوں، امروٹ شریف کے حضرات ہوں، دین پور شریف کے حضرات ہوں یا یہاں سرحد کے بزرگ، یہ جتنے حضرات گزرے ہیں تمام کے تمام بزرگوں کو دیکھ لیں یہ علم کے بھی امام تھے اور طریقت کے بھی امام تھے، سب کے سب جامعین شریعت وطریقت تھے، اس لیے کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ علم میں بھی برکت نہیں آتی اور اس کا فیض بھی عام نہیں ہوتا جب تک کہ آدمی اپنے قلب کی اصلاح نہ کر لے۔ ہمارے تمام اکابر رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحِ قلب کرانے کے اہتمام بے شمار واقعات ہیں۔ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فارغ ہونے کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ مجھے بیعت فرمالیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نہیں تمھارے لیے بہتر ہے کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکہ معظّمہ جاؤ اور اُن سے بیعت ہو، وہ میرے بھی شیخ ہیں اور تم اُن ہی سے بیعت کرو۔ تو حضرت سفر کرتے ہیں، اس زمانے میں مکہ معظّمہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت

میں جاتے ہیں، ان سے بیعت ہوتے ہیں، چھ مہینے حاضر خدمت رہتے ہیں پھر اجازت وخلافت لے کر واپس آتے ہیں۔ تمام اکابر کا یہی حال ہے، علوم دینیہ حاصل کرنے کے بعد اطمینان اور چین سے نہیں بیٹھتے تھے جب تک کہ اپنے شیخ سے سلوک طے کر کے اپنا تزکیۂ نفس اور اصلاحِ قلب نہیں کرا لیتے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں بھی اس کی توفیق عطا فرمائیں کہ ہم بھی اپنے مشائخ سے رجوع کریں اور ان سے اپنی اصلاح کرائیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ بڑا مشہور ہے، فرماتے ہیں ''بیعت ہونا سنت یا مستحب ہے لیکن تزکیۂ نفس ہر شخص پر واجب ہے۔'' گویا خالی بیعت ہو کے مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے، بلکہ بیعت کا اصل مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ اپنے شیخ کے پیچھے پڑ کے، حاجت مند بن کے، ان سے اپنی قلب کی اصلاح کرالیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

☆☆☆☆☆

(بقیہ صفحہ ''۱۴'' سے)

یہ تمام مذکورہ بالا مسائل اور ان کی جو تشقیقیں کی گئی ہیں وہ نفیاً یا اثباتاً کسی نہ کسی فرقہ کا معتقد علیہ اور مسلک ہیں، لیکن آپ نے دیکھا کہ عقلی تو ہم پرستی کے اعتراضات سے ان میں سے کوئی شق بھی بُری نہیں، یہ اعتراضات یا لوازم متخیلہ یا عقلی سرگردانیاں کیوں پیدا ہوئیں، اس لیے کہ ہم قرآن کی تلقینات پر قناعت نہیں کرتے، اور اُن اُمور کی تشریح چاہتے ہیں جن کی تشریح سے عقلِ انسانی عاجز ہے، اور ہماری عملی زندگی کیلئے وہ غیر ضروری ہیں۔

اگر ہم اپنے معتقدات کے احاطہ کو اس دائرہ کے اندر کرلیں جس کو وحی الٰہی کے پرکار نے سطح اسلام پر کھینچا ہے، تو یہ حصار ہمارے لیے یقیناً قلعہ روئیں کا کام دے گا، اور ہم اُن بہت سے خدشوں اور حملوں سے محفوظ ہو جائیں گے جو قرآن کی تصریحات کے سبب نہیں بلکہ خود ہمارے عقلی تفصیلات کے باعث ہم پر عائد ہوتے ہیں، اور غلطی سے ہم ان کا مستوجب اپنے مذہب کو قرار دیتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆☆☆

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ''وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلے میں جو بلا مسواک پڑھی جائے ستر گنا فضیلت رکھتی ہے۔''

عبدالغفور صاحب لائبریرین خیبر
میڈیکل کالج پشاور

﴿اعتراف (confession)﴾

اعتراف کے معنی رضا کارانہ طور پر مان لینے کے ہیں۔ اپنی کوتاہی یا غلطی کو تسلیم کرنے کو بھی اعتراف کہتے ہیں اور ایک ابدی اور اٹل حقیقت تسلیم کرنا بھی اعتراف کہلاتا ہے۔ بعض اعترافات ایسے ہوتے ہیں جو کوئی اگر خود تسلیم نہ بھی کرے لیکن ساری دُنیا اس کی معترف ہوتی ہے۔ جیسے جنگ میں یا کسی اور مقابلے میں شکست کا اعتراف وغیرہ جبکہ بعض اعترافات وہ ہوتے ہیں، جن کا تعلق انسان کے باطن سے ہوتا ہے۔ اور یہ اَنا پرستی (Egoism)، خواہشات وغیرہ کے مقابلے میں کسی ابدی حقیقت کا اعتراف ہوتا ہے۔ یہاں پر کھنے کے لیے دُنیا موجود نہیں ہوتی بلکہ یہاں منصف یا ریفری انسان کا اپنا زندہ ضمیر ہی ہوتا ہے۔ مشہور فرانسیسی فلسفی روسو کا اعتراف یعنی (Confession) بھی شاید اسی قبیل کا تھا۔ یہی اعتراف کردار کی عظمت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ زندگی بہت بڑی امتحان گاہ ہے۔ اس کا پل پل نئے تجربات اور حوادث سے بھرا ہوتا ہے۔ ہر نئی صورتِ حال (Situation) کا مقابلہ کرنا اور (Deal) کرنا، کچھ نتائج فراہم کرتا ہے۔ یعنی ہر صورتِ حال میں انسانی رویہ (Behavior) یا مثبت ہوگا یا پھر منفی ہوگا۔ جس کے اُوپر حاصل شدہ نتائج کا بھی دارومدار ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے شروع دن سے ہر انسان کے اندر ضمیر کے نام سے ایک ایسا (Recording Device) حفاظتی آلہ فِٹ کیا ہے جو صحیح اور غلط کی برابر Indication (نشان دہی) کرتا رہتا ہے۔ یہی آلہ انسان کے اندر موجود رہتا ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں اس کی لطافت اور شفاف پن Shining (چمک) بھی مدہم پڑ جاتی ہے۔ اگرچہ ہر قسم کے دھچکے سہنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے لیکن دو چیزیں ایسی ہیں جن سے اس کو زَنگ لگنے کا بہت خطرہ رہتا ہے، ایک تعصب (Prejudice) اور دُوسرا اندھی تقلید (Blind Following)۔

دُنیا کے کونے کونے میں آج نظریات کی جو جنگ برپا ہے ہر جگہ ان نظریات کے مبلغین کا نشانہ انسانی ضمیر ہی ہوتا ہے، اور ہر غلط نظریہ اس وقت تک کسی ذہن میں جڑ نہیں پکڑ سکتا جب تک وہ اس خود کار مشین کو مسخ (Distort) نہ کردے۔ اس ذہنی Distortion (زوال) کو Brain Washing (ذہن بدلنا) کہتے ہیں۔ یہ دراصل دماغ کی صفائی نہیں ہوتی بلکہ یہ ضمیر کے اُوپر تعصب اور تقلید کی گندگی مَلنا ہوتی ہے۔ جس کے بعد آپ کو Fluid Iron (پگھلا ہوا لوہا) اور Moulding Iron (سانچہ) مل

جاتا ہے، جس کو جہاں موڑنا چاہا موڑ لیا جاتا ہے۔ بقولِ علامہ اقبال مرحوم ؎

باقی نہ رہی وہ تیری آئینہ ضمیری

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

جب ضمیر مسخ ہو جاتا ہے تو پھر اعتراف اور رجوع کے بجائے ہٹ دھرمی آجاتی ہے، اور پھر ایسے بد قسمت انسان کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور وہ کردار کے زوال کا سفر طے کرتے کرتے اسفل السافلین کی گہری گھاٹی میں گر جاتا ہے۔ ثابت ہوا کہ اعتراف، کمزوری یا بزدِلی کا نام نہیں بلکہ یہ جرأت اور کرار کی عظمت کی علامت ہے۔

لفظ 'اَنا' (Egoism) کے اگر خود غرضی اور خود پرستی معنی لیے جائیں تو پھر یہ ایک منفی رویہ کا سبب بنتا ہے۔ لیکن اگر اسی اَنا کے ساتھ ایک زندہ ضمیر موجود ہو تو پھر یہ خود پرستی سے خود آگاہی (Self-Realization) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور یہی پھر تلاشِ حق کے سفر کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔ اب اس کو اَنا کے بجائے خودی کہتے ہیں۔ اس لفظ کو انہی معنوں میں سب سے پہلے دُنیائے جدید میں شائد علامہ اقبال مرحوم نے ہی متعارف کرایا ہے، اور اسے مردِ مومن کے لیے سب سے بڑا ہتھیار قرار دیا ہے۔ ضربِ کلیم میں اپنی ساری زندگی کی سوچ اور ہزاروں صفحات کی کتابیں جس میں اسرارِ خُودی بھی ہے کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا:

خُودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ   خُودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

خُودی کا چھپا ہوا راز لا الہ الا اللہ ہے۔ اگر خُودی تلوار ہے تو اس کو تیز کرنے والا آلہ (فساں) لا الہ الا اللہ۔ یعنی جب انسان اپنی ہستی کو خُودپرستی اور اَنا پرستی کی حیثیت سے مِٹا دیتا ہے اور خُود آگاہی و خُدا آگاہی کے طور پر پہچان لیتا ہے تو پھر یہ چیز ایک عظیم قوت اور ہتھیار کے طور پر اس کا سہارا بنتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ (بخاری عن ابی ھریرہ)

(تم میں سے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اِکرام کرے)

علامہ سید سلیمان ندویؒ

﴿اہلِ سُنت و الجماعت﴾ (قسط نمبر: ٤)

اللہ اکبر! اسلام کی حقیقت پر کتنے پردے گئے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے لیے صرف آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا دینا کافی سمجھتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک آج کوئی مسلمان..... مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک نسفی کے تمام بندھے ہوئے عقائد پر حرفاً حرفاً آمنت نہ کہتا جائے۔

جنگ ہفتا دودلت همه راغذربنه   چوں ندید ند حقیقت ره افسانه زوند

پہلی دونشستوں میں ہم یہ اچھی طرح واضح کر چکے ہیں کہ مذہب کی اصلی اور حقیقی تصویر وہی ہے جو داعیِ مذہب کے علم وعمل اور اس کی تعلیم وتلقین کا صحیح اور ہُو بہُو عکس ہو، پیغمبر کی ضرورت ہم نے اسی لیے تسلیم کی ہے کہ عقلِ انسانی زندگی کی اصلی گرہوں کے کھولنے سے عاجز ہے، اس لیے رحمتِ الٰہی انسانیت کے ایک بلند ترین پیکر کو رُوح القدس کے توسط سے انسانوں کی رہنمائی کیلیے بھیجتی ہے، وہ لوگوں کو ہر قسم کے تلقینات سے مشرف کرتا ہے، اُن کو ان کی زندگی کے ہر شعبہ کیلیے تعلیمات دیتا ہے، لیکن مافوق الفہم اسرار کے سمجھنے کی حیاتِ انسانی کو حاجت نہیں اور اس کی عملی زندگی کے لئے اُن کا علم ضروری نہیں، ان کو وہ اسی طرح سربستہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور ان کے متعلق وہ صرف یہ سکھا جاتا ہے۔

وَمَايَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ م وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (ال عمران:۷)

ترجمہ: ''اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو علم میں راسخ اور پختہ ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اُس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔''

اس بنا پر اگر ہم ان اعتقادات اور تعلیمات پر جو پیغمبر نے انسانوں کے لیے ضروری سمجھیں، اپنی عقل اور سمجھ سے کچھ اضافہ کرنا چاہتے، یا کچھ اس میں سے حذف کرنا یا بڑھانا چاہتے ہیں، یا جس گرہ کو جہاں تک اس نے کھول کر چھوڑ دیا ہے ہم اس کو اور کھولنا چاہتے ہیں تو درحقیقت ہم اصل نبوت کے ثبوت کے دعویٰ کو کمزور کر رہے ہیں، اور عملاً ہم بتانا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی تکمیل کے لیے پیغمبر کی حاجت نہیں، بلکہ خود عقل انسانی ہماری رہبری کے لیے کافی ہے حالانکہ اس کا بطلان ہمارے نزدیک بدیہی الثبوت ہو چکا ہے۔

غور کیجیے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کی عملی زندگی کے لیے وہ چراغِ راہ ہے، انسان اور اس کی عملی زندگی کا تعلق تمام تر مادیات سے ہے اس لیے ماورائے مادہ کی نسبت صرف وہیں تک اس کو تعلق ہے جہاں تک انسان کی عملی زندگی کے لیے ضروری ہے، ہم اپنے مقصود کو اور زیادہ واضح کرنے کے

لئے ذرا تفصیل سے کام لیتے ہیں۔

مذہب میں دو چیزیں ہوتی ہیں، عقائد اور اعمال، دوسرے الفاظ میں ان کی تعبیر یہ ہوسکتی ہے کہ مذہب علم اور عمل سے مرکب ہے۔

علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو مادیات سے ماخوذ ہے اور انہیں سے وابستہ ہے اور اس کے متعلق ہم میں بذریعہ مشاہدہ اور تجربہ کے یقین پیدا ہوتا ہے، دوسرا وہ علم ہے جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے، اور جس کے جاننے کا ذریعہ صرف تخیل، تصور اور ظن ہے۔ ''آگ جلاتی ہے'' یہ علم مادی ذریعۂ احساس سے ہم کو حاصل ہوا ہے، اس لیے ہم کو اس درجہ یقین ہے کہ غلطی سے بھی ہم آگ میں کودنے کی ہمت نہیں کرسکتے لیکن دوسرا علم یہ کہ انسان مرنے کے بعد پھر دوسرا جنم لیتا ہے لیکن اس علم پر اعتماد کرکے کیا کوئی انسان اپنی زندگی کا آپ خاتمہ کردینے پر تیار ہوگا؟

ہماری زندگی اسی عالمِ مادی سے تعلق رکھتی ہے ہمارے اعمال اسی عالم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افرادِ انسانی کی کامیابی اور ناکامی، قوتیں اور قوموں کی ترقی و تنزل، عروج و زوال، انقلاب و تغیر، غرض انسانیت کے جملہ مظاہر اور عالم کا تمام تر نظامِ ترقی انہیں یقینیات اور علوم قطعیہ پر مبنی ہیں، جن کا ماخذ ہمارے حواس ہیں، اس بناء پر ان علوم و مسائل اور معلومات کے پیچھے پڑنا اور انکی گرہ کشائی چاہنا، جو ماورائے حواس ہیں اور جن کے ساتھ ہمارا علم متعلق نہیں ہوسکتا، ہمارے لیے بالکل بے سود اور غیر مفید ہے۔

ہمارا فلسفہ جس کا تعلق ماورائے مادہ سے ہے، ''علم ظنی'' ہے۔ سائنس کا اکثر حصہ ہمارے گذشتہ تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر ایک حدتک درجۂ یقینی رکھتا ہے اب دیکھ لیجئے کہ دُنیا ان دونوں میں سے کس کی ممنون ہے۔ فلسفہ کی یا سائنس کی؟

یونان کے سب سے پہلے فلسفی تالیس سے لے کر بیکن کے عہد تک ڈھائی ہزار برس میں فلسفہ دُنیا کے لیے کیا کارآمد ہوا، لیکن سائنس نے دو تین سو برس کے اندر اندر عالم میں ایک انقلاب پیدا کردیا، اس بناء پر غیر مادی اور غیر محسوس اشیاء کی نسبت یہ سوال کہ وہ کیا ہیں؟ اور کیونکر ہیں؟ بالکل بے سود ہے اور اس کی دلیل، اس سوال کے حل میں انسانی نسلوں کی گذشتہ صدیوں اور قرنوں کی ناکامی ہے، اس لیے ہماری بحث اور تحقیقات کا موضوع نفیاً یا اثباتاً، غیر محسوس اشیاء نہیں ہوسکتیں۔

یہی وہ نکتہ ہے جس کو یورپ نے اب سمجھا ہے اور جس کو اسلام نے اپنے آغازِ ظہور ہی میں واشگاف

کردیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اہل السنۃ کے سوا اسلام کے اور فرقوں نے اس کو محفوظ نہیں رکھا، اور یہی آخران کی بے راہ روی کا سبب ہوا۔ اوراس کا بڑا نقصان یہ پہنچا کہ ہماری خیالی دُنیا وسیع ہوگئی مگر عملی دُنیا تنگ ہوگئی۔ منطق وفلسفہ کی خیالی وقیاسی بحثوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر تجربی مادی علوم سے جن کا مدار اشیاء کے خواص وصفات کی معرفت پر ہے ہم بے خبر ہوگئے اور دشمن ہم سے بازی لے گیا، اور ہم عملی ومادی دُنیا کی ہر چیز میں اُن کے محتاج ہوگئے، یہ عملی نقصان تو عملی اقتصادی حیثیت سے پہنچا، اور دِین کی حیثیت سے یہ نقصان پہنچا کہ عقائد کی ان عقلی پیچیدگیوں میں اُلجھ کر اخلاق وعمل میں ہم سست ونا کارہ رہ گئے۔ اور دِین ودُنیا ہر حیثیت سے ہماری عملی قویٰ کمزور اور سست ہوتے چلے گئے، اس تفصیل میں یہ ظاہر ہوگا کہ اہل سنت کے مذہب کا مدار اور منتہیٰ یہ دو اُصول ہیں۔

(۱) داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عقائد اور اعمال کے متعلق اپنی اُمت کو جو کچھ تعلیم اور تلقین کی، اس پر استوار رہا جائے، یہی صراط مستقیم ہے۔

(۲) عقائد یا خدا کی ذات اور صفات کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا، اور جس مسئلہ کی جس حد تک قرآن نے تشریح کی، صرف اسی پر ایمان لانا واجب ہے۔ صرف اپنی عقل وقیاس واستنباط سے نصوص کی روشنی کے بغیر اس کی تشریح وتفسیر صحیح نہیں، اور نہ اس پر ایمان لانا اسلام کی صحت کے لیے ضروری ہے بلکہ ممکن ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا موجب ہو۔

اسلام کے تمام فرقے اگر ان دو اُصولوں پر قائم رہتے تو یقیناً عقائد کے وہ عظیم الشان اختلافات رونما نہ ہوتے، جس کے سیلاب نے ایک مدتِ مدید سے کاشانۂ اسلام کے ارکان متزلزل کرر کھے ہیں۔ خوب غور کیجیے، گذشتہ مباحث میں ہم نے مختلف فرقوں کے جو مسائل اور معتقدات گنائے ہیں اُن کی گمراہی کا سبب صرف یہی ہے کہ اُنہوں نے اُن اُمور کی تفصیل چاہی جن سے قرآن خاموش تھا، اور جن کی تشریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری نہیں سمجھی، کہ اوّل تو وہ اُن سربستہ اسرار اور مشکل عقدوں میں سے ہیں جن کا حل عقلِ انسانی کے فہم وادراک سے باہر ہے، اور ثانیاً یہ کہ انسان کی عملی زندگی کے لیے ان کا علم بے سود ہے۔ شریعت نے خدا کے متعلق یہ بتایا کہ وہ ایک ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ تمام اعلیٰ صفتوں سے متصف ہے، اور ہر عیب سے پاک ہے۔ اس کے بعد یہ بحث کہ وہ ''ایک'' کس حیثیت سے ہے، صفات کی مختلف قسمیں ہیں، کون سی صفتیں اُس میں پائی جاتی ہیں، یہ صفات اُس کی ذات میں داخل ہیں یا اُس کی

ذات سے الگ ہیں۔ اگر الگ ہیں تو قدیم ہیں یا حادث، اگر قدیم ہیں تو تعدد قدما لازم آتا ہے حالانکہ قدیم صرف ایک ہی ہے، اگر حادث ہو تو خدا محل حادث ہوگا، اور محل حادث خود حادث ہوتا ہے اگر الگ نہیں بلکہ ذات میں داخل ہیں تو ذات کا جز ہو کر یا کل ہو کر، اگر ذات کا جز ہے تو خدا کی ترکیب لازم آتی ہے، اور اگر کل ہے تو عین ذات ہوگی، اس لحاظ سے اس کی ذات اور صفات میں سے ایک کی نفی لازم آئے گی، اور علم، قدرت، سمع، بصرہ، اِرادہ وغیرہ مختلف صفات مختلف نہیں بلکہ متحد ہو جائیں گی۔

خدا کی نسبت ہاتھ، پاؤں، منہ اور قدم کے الفاظ کتاب وسنت میں آئے ہیں۔ ان سے حقیقی معنی مراد ہیں یا مجازی، خدا کی نسبت قرآن میں ہے، کہ ''وہ عرش پر مستوی ہوا۔ اور یہ بھی ہے کہ جدھر رُخ کرو اُدھر ہی خدا کا منہ''، یہ بھی ہے کہ ''وہ تمھاری رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔'' تو آیا وہ کسی خاص جگہ میں ہے، یا جگہ سے مبّرا ہے، پہلی صورت میں اس کا جسم ہونا لازم آتا ہے اور دوسری صورت میں کسی خارجی موجود کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ہر جگہ موجود ہے، سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ قیامت میں خدا بہشت میں بہشتیوں کو نظر آئے گا، اب اس پر بحث کہ اگر یہ تسلیم کرلیں گے تو لازم آئے گا کہ وہ جسم ہو، کسی خاص جگہ میں ہو اور اگر نظر آنا تسلیم کریں تو انہیں آنکھوں سے وہ رویت ہوگی، یا کسی اور جدید حاسّہ سے، ان آنکھوں سے نظر آنا، خدا کے لیے جسم، رنگ، تحدید، تعیین وغیرہ کو مستلزم اور آخری صورت میں موجودہ ذرائع احساس کے علاوہ کسی اور ذریعہ احساس کا اعتقاد فہم سے بالاتر ہے۔

شریعت میں اس قدر ہے کہ خدا نے عالم کو پیدا کیا اور وہ اُس کی مخلوق ہے، اس کے بعد یہ مباحث کہ خداوند تعالیٰ اس کی علت کامل ہے یا ناقص، اگر علت ناقص یعنی غیر تامہ ہے تو عالم کی خالقیت کے لئے کسی اور شے کی شرکت بھی لازم آتی ہے۔ اور اگر علت کامل یعنی تامہ ہے تو علت تامہ اور معلول کا وجود ساتھ ہوتا ہے، اس بناء پر عالم کو بھی قدیم ہونا چاہیے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ بندوں کے تمام افعال خدا کے حکم سے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سوالات کہ اسکا حکم ہی فعل کے وجود کا سبب ہوتا ہے، یا بندہ کے عمل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اگر دخل نہیں تو بندہ کو مجبور محض کہنا ہوگا۔ اگر دخل ہے تو یہ دخل موثر ہے یا غیر موثر، اگر موثر ہے تو درحقیقت وہ اپنے فعل کا آپ خالق ہوا، اور اگر غیر موثر ہے تو دوسرے معنی میں جبر ہے۔ (باقی صفحہ ''۸'' پر)

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر فدا محمد مدظلہٗ

﴿اصلاحی مجلس﴾

يَآاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات:۱۲)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔''

شیطان بدگمانی کا ہتھیار مختلف جگہوں پر استعمال کرتا ہے۔ ملازمت میں آپس کی بدگمانیاں، میاں بیوی میں بدگمانیاں، مُرید کو پیر سے بدگمان کرتا ہے، کاروبار میں آپس میں بدگمانی پیدا کرنا۔ یہ شیطان کی ایسی چال ہے جس سے بعض اوقات کتابیں پڑھے علماء اور مدرسہ کے شیخ الحدیث تک محفوظ نہیں رہتے۔

میاں بیوی کی ایک دوسرے سے بدگمانی گھریلو ناچاقیوں کے ساتھ کئی قسم کی نفسیاتی بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ شیطان بعض اوقات میاں کے دل میں بیوی کے خلاف بدگمانی پیدا کرتا ہے اور شوہر کے دل میں یہ بات آتی ہے کہ بیوی بدکار ہے۔ پنڈی سے ایک صاحب میرے پاس آئے، جو اپنی بیوی سے اس قسم کی بدگمانی رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اُن کی اولاد ناجائز ہے اور وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کا اِرادہ بھی رکھتے تھے تحقیقی سوالات کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کی باتوں میں کوئی حقیقت نہیں اور ان کے پاس اپنے وہم کے ٹھوس دلائل بالکل نہیں لیکن محض وساوس کے آگے ہتھیار ڈال کر اپنے گھر کو اُجاڑ رہے تھے۔ ان وساوس کی وجہ حکیموں کے نزدیک بدن میں خلطِ سودا یا صفراء کی زیادتی اور جدید ڈاکٹروں کے نزدیک ڈوپامین (Dopamine) کی کمی یا زیادتی ہوتی ہے، جس کا ماہر سے علاج کرانا ضروری ہوتا ہے۔

زیارت کا کا صاحب سے کچھ ساتھیوں نے پیغام بھیجا کہ یہاں ایک وکیل صاحب ہیں، پیپلز پارٹی کے اوّلین دور کے کارکنوں میں شامل رہے۔ ان کی ذہنی حالت صحیح نہیں تھی، کچھ افاقہ ہوا ہے جس سے دِین کی طرف مائل ہوئے لیکن کسی دِینی سیاسی پارٹی کے ساتھ ہو گئے جہاں ہنگامہ خیز زندگی کی وجہ سے دوبارہ بیمار ہونے کا خطرہ ہے ساتھیوں کا یہ اِرادہ ہوا کہ بندہ وہاں جائے اور اسے ترغیب دے کر تبلیغی جماعت میں شامل کر دے تا کہ دینداری کی زندگی کے ساتھ کچھ پرسکون ماحول بھی مل سکے۔ بندہ وہاں حاضر ہوا ہماری تشخیص تو رُوحانی ہوتی ہے، اس کے حالات سننے سے پتا چلا کہ جب یہ چھوٹا تھا اسی وقت سے ان کی والدہ اور والد صاحب کی آپس میں ناچاقی اور جدائی ہوگئی تھی۔ یہ ہمارے صوبہ سرحد کے ماحول کی بدقسمتی ہے کہ جدائی کر کے ساری عمر بیوی کو لٹکائے رکھیں گے لیکن طلاق نہیں دیں گے اور اس کو نام نہاد غیرت کے خلاف سمجھیں گے یا قتل تو کر دیں گے لیکن طلاق نہیں دیں گے۔ چنانچہ اس نوجوان کی ایسی کڑھن کی فضاء میں پرورش ہوئی۔ بہر حال

ہمارے سلسلہ میں علاج کا طریقہ کار، بار بار ہماری مجلس کی حاضری ہوتی ہے۔ہم کوئی خوجہ معین الدین اجمیریؒ یا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تو ہیں نہیں کہ ایک نظر دیکھ کر بیماری دُور کردیں۔اُن حضرات کی بھی اسّی نوے سالہ زندگی میں بھی چند ہی واقعات ایسے پیش آئے ہونگے۔ورنہ عمومی زندگی میں وہ بھی اسباب اختیار فرماتے تھے۔وکیل صاحب کچھ مُدّت بعد میڈیکل کالج میں مجھ سے ملے، ملنے سے اندازہ ہوا کہ ان کی گھریلو ناچاقیوں نے انھیں ہیروئن کا عادی بنادیا ہے۔لہٰذا انھیں علاج کے لیے ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔تو شیطان کے اس فریب میں آنے سے خاندان، صحت، زندگی سب تباہ ہوکررہ جاتے ہیں۔

شیطان یہی بدظنی کا ہتھیار مُرید پر بھی آزماتا ہے، پیر کی بعض عادات اور باتوں کو خلافِ شرع بنا کر مُرید کے سامنے پیش کرتا ہے جس سے مُرید اپنے پیر سے بدظن ہوجاتا ہے۔اس میں قصور اکثر مُرید کا ہوتا ہے، کہ دِینی علم وفہم نہ ہونے اور شریعت کی باریکیوں سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے پیر کے خلاف تنقیدی جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔یا تو مُرید دِینی علم وفہم والا ہو کہ دِینی مسائل کی باریکیوں کو جانتا ہو، نہیں تو اس کے لئے حکم ہے کہ جب اس نے تسلّی کرکے پیر سے بیعت کرلی ہے تو اس کی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کے متعلق اچھا گمان رکھے، الّا یہ کہ اس دور کے محققین مشائخ اس بات کی نشاندہی نہ کردیں کہ اس شیخ کے اعمال اب قابلِ اعتبار نہیں رہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا دِینی فہم، مسائل کی باریکیوں کو سمجھنا اور ان کی تہہ تک جانا نہایت اعلیٰ تھا اور اسی بات میں وہ اپنے ہم عصروں پر فوقیّت رکھتے تھے۔امام اعظمؒ کے زمانہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر صبح صادق تک تم نے مجھ سے کوئی بات نہ کی تو تمہیں تین طلاق، بیوی نے بھی غصّے میں کہا کہ مجھے بھی اللہ کی قسم کہ میں صبح صادق سے پہلے تم سے کوئی بات کروں۔اب شوہر اس انتظار میں تھا کہ بیوی بات کرلے گی لیکن بیوی بھی اپنی قسم پر قائم رہی اور بات نہیں کی۔اب صبح دونوں اپنی بات پر پشیماں ہوئے۔پریشانی کی حالت میں وہ شخص علاّمہ ابنِ سیرینؒ کی خدمت میں پہنچا اور واقعہ بیان کیا۔ابن سیرینؒ نے فرمایا کہ طلاق ہوچکی ہے اور اب تیری بیوی تجھ پہ حرام ہے۔وہ شخص امام اعظمؒ کے پاس پہنچا، امام اعظمؒ نے پورا واقعہ سننے کے بعد فرمایا کہ طلاق نہیں ہوئی۔وہ آدمی پھر علامہ ابنِ سیرینؒ کے پاس گیا اور امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ سنایا۔علامہ ابنِ سیرینؒ غصے میں بھرے ہوئے امام ابوحنیفہؒ کے پاس آئے اور کہا کہ تو کیسے فتوے دیتا ہے۔امام اعظم صاحبؒ نے ان سے بیان دُہروایا پھر فرمایا کہ خاوند کی طلاق کے بعد جو عورت

نے قسم کھائی تو یہی تو صبح صادق سے پہلے کلام ہوگیا۔ابنِ سیرینؒ نے فرمایا واقعی جس جگہ تمہارا ذہن پہنچتا ہے ہمارا ذہن نہیں پہنچتا۔

ایک دوسرا واقعہ ہے۔ایک بار امام اعظمؒ نے اپنے شاگردوں سے مسئلہ پوچھا کہ ہنڈیا میں اگر پرندہ گر کر مرجائے تو کیا کرنا چاہیئے؟ شاگردوں نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بتایا کہ شوربا پھینک دینا چاہیئے اور گوشت کو دھوکر کھالینا چاہیئے۔امام اعظمؒ نے فرمایا اگر ہنڈیا گرم ہے اور پرندہ اس میں گر کر مرجائے تب تو شوربا اور گوشت دونوں پھینک دینے چاہئیں،اور اگر ہنڈیا ٹھنڈی ہے اور پرندہ گر کر مرجائے تو صرف شوربا پھینک دینا چاہیئے اور گوشت کو دھوکر کھالینا چاہیئے۔بات یہ نہیں کہ امام اعظمؒ کا تقویٰ وعلم حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تھا بلکہ ممکن ہے کہ امام اعظمؒ کے سامنے یہ دونوں صورتیں پیش آئی ہوں اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے صرف ایک صورت پیش آئی ہو۔

یہ تو امام اعظمؒ کا فہمِ دِینی تھا،جو بات کی تہہ تک جا کر مسائل حل فرماتے تھے۔تو مُرید یا تو علم والا ہو کہ شیخ کے عادات واعمال میں باریکیوں کو سمجھے،اگر ایسا نہیں تو شیخ پر اندھا اعتماد کرے۔حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ مُرید میں اتنا علم ہو کہ میری ترتیب کی باریکیوں کو سمجھ سکے یا ایسا عاشق ہو کہ ہر بات پر اعتماد کرے۔

ہمارا ایک سادہ سا دیہاتی ساتھی ہے،کسی نے اس سے کہا کہ تم ایسے ہی ڈاکٹر صاحب کے معتقد بنے ہوئے ہو یہ تو سارا دن کالج میں لڑکیوں کے درمیان بیٹھا ہوتا ہے۔اس نے جواب دیا کہ کسی ضرورت کے تحت بیٹھتے ہونگے ویسے ہی نہیں بیٹھتے۔ایسا حسنِ ظن رکھنے والا مُرید ہونا چاہیے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور صلی اللہ وعلیہ وسلّم نے صلح نامہ پر دستخط فرما کر عمرہ کا اِرادہ اگلے سال کے لئے ملتوی فرمادیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین،جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے خواب کی بناء پر یہ سمجھ رہے تھے کہ اِسی سال عمرہ ادا کرینگے،سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوگئے۔یہ صحابہ کرامؓ کے لئے بہت بڑا امتحان تھا کیونکہ بات کرنے والا کوئی عام ولی نہیں،کوئی صحابی نہیں بلکہ امام الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تھے۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے صحابی بڑی تیزی کے ساتھ اُٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے: ’’ابوبکر! کیا وہ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟‘‘

صدیق اکبرؓ نے فرمایا: ’’بیشک ہیں‘‘

پھر فاروقِ اعظمؓ نے کہا: کیا ہم مسلمان نہیں؟ انھوں نے کہا بیشک ہیں۔عمر فاروقؓ نے پوچھا کیا وہ

لوگ مشرک نہیں ہیں؟ صدیقِ اکبرؓ نے کہا بیشک ہیں۔ تب حضرت عمرؓ نے کہا:

''پھر آخر کس بناء پر ہم اپنے دِین کے معاملے میں یہ ذلت گوارا کریں؟''

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

''اے عمر! آنحضرت ﷺ کے احکام اور فیصلوں پر سر جھکاؤ۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ اے شخص وہ اللہ کے رسول ہیں اور اپنے پروردگار کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اللہ ان کی مدد فرماتا ہے، تم کو لازم ہے کہ مرتے دم تک آپ ﷺ کے احکام کی اطاعت کرتے رہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔''

اسی وقت حضرت عمرؓ نے بھی کہا کہ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔''

اس کے بعد حضرت عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے بھی وہی سب باتیں کہیں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہہ چکے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب سن کر فرمایا:

''میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں کسی حالت میں بھی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور وہی میرا مددگار ہے۔''

حضرت عمرؓ دیر تک اپنی بات پر جمے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوعبیدہؓ نے ان سے کہا کہ اے ابنِ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرما رہے ہیں کیا تم اس کو سن نہیں رہے ہو؟ ہم شیطان مردُود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے بھی شیطان مردُود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔

بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اس وقت جو کچھ بات چیت کی تھی وہ اگرچہ اس تمنا میں تھی کہ اس معاملہ میں خیر اور بہتری ظاہر ہو مگر اپنی اس گفتگو کے خوف سے میں اس کے بعد ہمیشہ روزے رکھتا، صدقات دیتا، نمازیں پڑھتا اور غلاموں کو آزاد کرتا تھا۔

اس موقع پر حضرت عمرؓ کا جو اضطراب اور بے چینی ہے وہ نعوذ باللہ کسی گستاخی کی نیت سے نہیں بلکہ درحقیقت یہ سب کچھ ان کے عشقِ رسول اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ شدید محبت کی بناء پر تھا کیونکہ ظاہری طور پر اس معاہدے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کو بہت زیادہ مراعات دی تھیں، مگر نبی ﷺ کا فیصلہ آسمانی فیصلہ تھا اور اس میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو سربلندی اور انجام کار کو کامیابی پنہاں تھی اس کو

دُور بین نظریں دیکھ رہی تھیں۔ دوسرے لوگوں پر حقیقتیں عیاں نہیں تھیں اس لیے حضرت عمرؓ پر ایک دم تحیر اور حیرانی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ شرائط کی ظاہری نوعیت سے جب انھوں نے یہ سمجھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک ہوتی ہے اور مشرکوں کا پلہ بھاری نظر آتا ہے تو اس حیرانی کی کیفیت نے اضطراب اور بے چینی کی صورت اختیار کرلی یہاں تک کہ اسی عالم میں اُٹھ کر وہ صدیقِ اکبرؓ کے پاس پہنچ گئے اور پھر براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض معروض کی جو صرف ان کے اضطراب اور عشقِ رسول اللہ ﷺ کا مظاہرہ تھا۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

گفتگوئے عاشقاں درکارِ رب

جوشش عشق است نے ترک ادب

یعنی پروردگار کے کاموں میں اس کے عاشقوں کا گفتگو اور کلام کرنا ان کے بڑھے ہوئے عشق اور جوش محبت کا نتیجہ ہوتا ہے، خدانخواستہ بے ادبی یا گستاخی و جسارت کی وجہ سے نہیں ہوتا۔

یہ سخت امتحان کا وقت تھا۔ اس وقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات تھی جو کسی ذہنی وسوسے میں مبتلا نہیں تھے اور مکمل اطمینان تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سچے عاشق تھے، آپؓ کو نسبتِ اتحادی حاصل تھی، آپؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اعلیٰ درجہ کی معرفت حاصل تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے عاشق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں اعلیٰ درجہ پر ہیں، اللہ تعالیٰ کی معرفت نہ ختم ہونے والی ہے، لامحدود ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سیر فی اللہ حاصل ہے، آپ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں درجۂ اعلیٰ کی طرف بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

تو بات ہو رہی تھی کہ مُرید کو سچا عاشق ہونا چاہیے۔ مولانا یحییٰ صاحبؒ، حضرت شیخ مولانا زکریاؒ کے والد صاحب، بڑے عالم تھے۔ ان کے شاگرد آپؒ سے بہت محبت کرتے تھے اور وہ بھی اپنے شاگردوں سے بہت محبت فرماتے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے، دوپہر میں وہ کنویں کی مُنڈیر پر بیٹھ جاتے اور آپؒ کے شاگرد ڈول بھر بھر کر آپؒ کے اُوپر ڈالتے تھے۔ ایک ظاہر بین عالم آپؒ کے پاس سے گزرا اور کہا، مولانا صاحب یہ اسراف نہیں؟ مولانا یحییٰ صاحبؒ نے جواب دیا تمہارے لیے اسراف ہے، میرے لیے نہیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ والد صاحبؒ نے غالباً اس وقت غسل کی نیّت کے علاوہ بدن کو ٹھنڈک و نشاط پہنچانے کی نیّت کی تھی تاکہ ذہن تروتازہ ہو، طالبعلموں کو اچھے ذہن کے ساتھ پڑھا سکیں۔

اس سب کے باوجود، پیر بھی آخر ایک انسان ہے، نسیان کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ شریعت کے ایک آدھ احکام سمجھنے میں غلطی ہوسکتی ہے۔ تو اس سے بدظن نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اگر پیر بار بار شرعی احکامات کو توڑ رہا ہے اور مرید ذہنی ہم آہنگی اور دِلی سکون واطمینان نہیں پا رہا تو ماہرین سے مشورہ کرکے کسی اور جگہ بیعت کا تعلّق قائم کرلے۔ لیکن پیرِ اوّل کی ہتک پھر بھی نہ کرے کہ اُس سے کم از کم اللہ کا نام تو سیکھا ہے۔

ثاقب صاحب نے ایک بار اپنے انجینیئر نگ کے کلاس فیلو کو لاکر بیعت کروایا تھا۔ وہ پہلے ایک بریلوی پیر سے بیعت تھا، وہاں سے تعلق توڑ کر یہاں آیا۔ یہاں آنے کے بعد اسے پیشاب کے قطروں کے وسوسے آنے شروع ہوئے۔ حتیٰ کہ مسجد کے صحن میں شلوار کھول کر دیکھتا تھا کہ قطرے تو نہیں نکلے۔ حالات سے اندازہ ہوا کہ اس سے پہلے والے پیر کی بے ادبی سرزد ہوئی جو اس مصیبت میں گرفتار ہیں۔

بات چل نکلی تھی بدگمانی والے مضمون سے۔ بدگمانی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایسے خیالات کو شروع ہی میں رَد کردے۔ ان کی طرف دھیان ہی نہ دے، وسوسے اُوپر ہی اُوپر سے گزر جائیں گے اور ان کو بالکل رَد کرکے توجّہ ہی نہ دینے سے آدمی اس مرض سے محفوظ ہو جائے گا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ جسمانی اور نفسیاتی امراض سے بھی بچالے گا۔ اس کے بالمقابل نیک گمان کا فائدہ آخرت کے ساتھ دُنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے۔ مثبت گمان رکھنے سے کئی قسم کے ذہنی امراض سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ تندرست ذہن، تندرست صحت والا انسان معاشرہ کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے۔ اگر کسی بات میں ظاہری طور پر معصیّت والی صورت دیکھ کر بھی ہم نے مثبت گمان اختیار کیا تو اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوگی اور ثواب بھی ملے گا۔ اور اگر اسی بات میں بدگمانی قائم کی تو اس کا آخرت میں جواب دینا ہوگا اور پورے ثبوت کے ساتھ ثابت کرنا پڑے گا۔

اچھا گمان رکھنے والے ایک نیک شخص کا واقعہ ہے کہ کوئی بزرگ فوت ہوئے۔ اُن کے ایک نیک مخلص مُرید نے سوچا کہ حضرت کی وفات کے بعد اب ان کے بیٹے سے اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہئے۔ ادھر بزرگ کے صاحبزادہ شُکرانوں کے عادی، پلاؤ زردے پر ہاتھ صاف کرنے والے، معرفت وطریقت سے کوسوں دُور، والدِمحترم کی وفات کے بعد روک ٹوک والا کوئی نہیں، اب یار دوستوں کے ساتھ شراب وکباب کی محفلیں سجنے لگیں۔ یہ شخص جس وقت صاحبزادہ صاحب سے ملنے آیا تو اس وقت اس شخص کا ہم نام خادم صاحبزادہ صاحب کے لئے شراب لینے گیا تھا۔ اِس شخص نے جب دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے صاحبزادہ

صاحب یہ سمجھ کر کہ خادم شراب لے آیا ہے، اس کا نام پکارا کہ آ گئے؟ اس مُرید نے اپنا نام جب صاحبزادہ کے منہ سے سنا تو اور بھی اس کی بزرگی کا قائل ہو گیا۔ فوراً اندر جا کر اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ میں آپ کے والد کا خادم تھا اب آپ مجھے اپنا خادم (مُرید) بنا لیجئے۔ صاحبزادہ صاحب کو اپنی اصلیّت کا تو پتا تھا ہی، اس ڈر سے کہ کہیں نوکر شراب لا کر اس کی بزرگی کا بھانڈا نہ پھوڑ دے، جان چھڑانے کی خاطر کہا فوراً جاؤ! آج کے بعد باغ کی رکھوالی و خدمت تمہارے ذمّہ ہے۔ مُرید خوش ہوا کہ پیر صاحب نے خدمت ذمّہ لگائی ہے، بیلچہ کُدال اُٹھا کر نہایت محنت و اخلاص کے ساتھ باغ کی خدمت میں لگ گیا اور عرصہ تک لگا رہا۔ اس کا اخلاص رنگ لایا۔ علاقے کا ابدال فوت ہو رہا تھا۔ مشورہ ہو رہا تھا کہ نیا ابدال کسے منتخب کیا جائے۔ طے پایا کہ فلاں باغ کا مالی اب اس ابدال کی جانشینی کا اہل ہے۔ جیسے ہی اسے نسبت منتقل ہوئی، معرفت اس پر کھل گئی، چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بیلچہ کُدال پیر صاحب کے حوالہ کر کے اجازت لے کر روانہ ہو گیا۔ غرض اپنے نیک گمان اور اخلاص کی بدولت اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لی کیونکہ اس نے ایک گنہگار پیر صاحب کو بھی اخلاص کی نظر سے دیکھا۔

شیخ سعدیؒ نے گلستان میں لیلیٰ مجنوں کا واقعہ بیان کیا ہے۔ بادشاہ کو پتا چلا کہ فلاں قبیلے کے سردار کا بیٹا قیس (مجنوں) لیلیٰ نامی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔ اس نے لیلیٰ کو محل بلوایا، دیکھا۔ کالی کلوٹی، کوئی ظاہری حسن صورت نہیں۔ مجنوں کو بلا کر اس نے حیرت سے پوچھا کہ تو اتنا اہلِ علم ہو کر تو ایسی عورت کو پسند کر رہا ہے جو کوئی خاص خوبصورت نہیں ہے۔ مجنوں نے بادشاہ کو جواب دیا۔ افسوس کہ تو مجنوں نہیں۔ اگر تُو مجنوں والی آنکھ سے لیلیٰ کو دیکھتا تو ہرگز یہ بات نہ کہتا۔

ہمارے مولانا صاحبؒ نے کئی بار یہ قصہ سنایا۔ شہر میں غلام کِبریا نامی نوجوان رہتا تھا۔ جو کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ لڑکا کہیں لڑکی کے عشق میں تباہ نہ ہو جائے اس کی کہیں شادی کرا دی۔ مدّت بعد ایک دن ماں نے لڑکے سے پوچھا۔ غلام کِبریا! اُس بلا کو بھولے ہو؟ غلام کبریا نے جواب دیا۔ اماں! وہ کوئی بھولنے والی چیز ہے۔ یہ کہہ کر مولانا صاحبؒ ایسے زور کا نعرہ لگاتے کہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کے باطن سے اُٹھنے والی عشقِ الٰہی کی لہر چھت کو پھاڑ کر رکھ دیگی۔ ہمارے مولانا صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ کے عشق میں اُونچا مقام حاصل تھا۔

ڈاکٹر سفیر صاحب یہاں بیٹھے ہیں۔ اِن کو خواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت

ہوئی۔فرمایا: سلسلے کی لہروں کو کم نہ سمجھنا۔ ہمارا سلسلۂ بیعت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے واسطے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم سے جاملتا ہے۔آپؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلیفہ تھے۔پھر آپؓ کے خلیفہ حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ تھے۔حسن بصریؒ کے خلیفہ حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید رحمتہ اللہ علیہ تھے،آپؒ کے خلیفہ حضرت فضیل بن عیاض رحمتہ اللہ علیہ تھے۔حضرت فضیل بن عیاضؒ سے پھر حضرت ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ اور اُن سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ ہم تک پہنچا ہے۔ ہمارے سلسلۂ بیعت میں بہت اُونچے لوگ ہیں۔ پیچھے سے فیض کی لہریں اپنی پوری طاقت کے ساتھ آرہی ہیں۔جیسے بجلی کی طاقت تاروں میں آرہی ہوتی ہے۔ چونکہ پیچھے طاقتور جنریٹرز ہائی پاور سپلائی کررہے ہیں، بیچ میں کہیں لکڑی کے کھمبے کا سہارا بھی لگادیا جائے تو سپلائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ایسے ہی سلسلہ کا فیض پورا آرہا ہے، جو بھی اخلاص کے ساتھ اس میں شامل ہوجائے گا تو اُسے اِن فیض کی لہروں کا پورا حصہ ملے گا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر طارق علی

﴿نوشتۂ دیوار﴾

برطانوی حکومت کی ایک حالیہ تحقیق کے مطابق مخلوط تعلیم (Co-education) میں لڑکوں کی کارکردگی لڑکیوں کی نسبت کمزور ہوتی ہے۔ یہ تحقیق محکمہ تعلیم کے زیرِ انتظام کیمبرج یونیورسٹی کے محققین نے کی اور یہ مطالعہ عرصہ چار سال میں برطانیہ کے پچاس (50) سکولوں میں کیا گیا۔

تحقیق کے مطابق لڑکیوں کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے کیونکہ وہ زیادہ تر اپنی تعلیم پر توجّہ دیتی ہیں جبکہ لڑکے زیادہ تر اپنی مردانگی کا اظہار کرنے میں اور، میں کچھ ہوں، کے احساس میں پڑ کر اپنی تعلیم کا نقصان کرتے ہیں اور امتحانات میں اچھی کارکردگی نہیں دِکھا پاتے۔لڑکے اکثر صنفِ مخالف کو متاثر کرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

محققین اس نتیجہ پر بھی پہنچے ہیں کہ زیادہ تر لڑکے لڑکیاں علیحدہ کلاسوں میں سہولت محسوس کرتے ہیں اور سیکھنے میں پوری دلچسپی لیتے ہیں اور اچھے نتائج دکھاتے ہیں۔اُنہوں نے بعض مضامین کے لئے جداگانہ تعلیمی اِداروں کے قیام کی تجویز پیش کی۔وزیرِ سکول ڈیوڈ ملی بینڈ (David Miliband) نے یک جنسی کلاسوں (Single Sex Classes) کی تجویز کا خیر مقدم کیا مگر تاحال حکومتی سطح پر کوئی منصوبہ سامنے نہیں آیا۔ (بحوالہ روزنامہ دی نیوز، ۳۰ مئی ۲۰۰۵ء)

انتخاب از سیرت کبریٰ

﴿خرقِ عادت اور معجزاتِ انبیاء﴾

حکیم علی الاطلاق (اللہ تعالیٰ) نے تمام دُنیوی اُمور کو اسباب کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ کسی امر کو سبب کے بغیر ایجاد نہیں کرتا۔ اس سُنتِ الٰہی کو عادت اور فطرت کہتے ہیں۔ لیکن خدائے قدیر بعض اوقات اپنی قدرتِ کاملہ کے اقتضاء سے اس عادت کو توڑ بھی دیتا ہے، جس طرح ہم اپنے اعضائے جسم پر پورا اختیار رکھتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں ان سے کام لیتے ہیں، اسی طرح ربُّ السمٰوٰت والارض اس بے جان عالمِ کائنات سے جس طرح چاہتا ہے مختلف افعال اور حرکات صادر کراتا رہتا ہے۔ اس کو پورا اختیار ہے کہ عادتِ مستمرہ کے مطابق اس سے کام لے یا اس کے خلاف افعال صادر کرائے۔

عطائے معجزہ کا مقصد:

چونکہ پیغمبروں کی برگزیدہ جماعت اس دعویٰ کے ساتھ مبعوث ہوتی تھی کہ خدا کے مامور اور سعادت دارین کے راہ نما ہیں، اور کوئی دعویٰ بغیر دلیل و برہان کے قابلِ قبول نہیں اور ظاہر ہے کہ عقلی اور لفظی دلائل سے الزام دے کر منکر کو خاموش کرنا نہایت دشوار ہے کیونکہ لسان اور جھگڑالو مناظر جس کا مقصد محض فریقِ مقابل کی شکست ہوتا ہے، بحث وجدل سے کسی طرح باز نہیں آتا۔ اس لئے جب خدائے حکیم انبیاء علیہم السلام کو اپنے بندوں کے پاس اس غرض سے بھیجتا کہ انہیں منجیات (نجات دلانے والی چیزیں) کا پتہ دیں اور مہلکات (ہلاک کرنے والی چیزیں) سے روکیں تو اپنی بعض قدرتوں کو بطورِ گواہ ان کے ساتھ کر دیتا تھا۔ ان قدرتوں کو معجزات، آیات براہین یا آیاتِ بیّنات کہتے ہیں۔

قاعدہ کی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے مکان یا دکان سے کوئی چیز منگوانا چاہتا ہے تو اپنے کسی معتمد علیہ کو کوئی ایسی نشانی دے کر بھیجتا ہے جسے دیکھتے ہی گھر والے فوراً پہچان لیں کہ پیام رساں ان کے مالک ہی کا فرستادہ ہے، اس طرح وہ اس کی طلب وخواہش کی تعمیل کرتے ہیں اور مطلوبہ چیز فوراً قاصد کے حوالے کرتے ہیں۔ اسی طرح معجزہ بھی انبیاء علیہم السلام کو نشان صدق کے طور پر دیا جاتا تھا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ صاحب واقعی خدائے برتر کے فرستادہ ہیں۔

عالم ملکوت کی چیزوں کو عیاناً دیکھنے کی صلاحیت:

جس طرح انسان کبھی خواب میں دیکھتا ہے کہ بکری اس سے باتیں کر رہی ہے، یا مرا ہوا شخص کوئی چیز دے رہا ہے، یا خواب دیکھنے والا اپنے آپ کو فضائے بسیط میں پرندوں کی طرح اُڑتے دیکھتا ہے یا وہ چشم

زدن میں ہزار ہا کوس کی مسافت پر پہنچ گیا ہے۔ یہی اور اس قسم کے دوسرے اُمور انبیاء و رسل کو بیداری میں پیش آتے تھے۔ عالم ملکوت کے اسرار ان کے دِل پر منکشف ہوتے تھے اور وہاں کی چیز انہیں اسی طرح عیاناً دکھائی دیتی تھیں جس طرح ہم زمین کی چیزوں کو برائی العین دیکھتے ہیں۔

قانون فطرت اس طریق پر جاری ہے کہ بھوک پیاس کھانے پینے سے دُور ہوتی ہے۔ حیوانات، حشرات، نباتات، جمادات انسان سے ہم کلام نہیں ہوتے۔ شجر و حجر کسی کے بُلانے سے بحرکتِ ارادی نہیں آتے۔ کوئی سطح زمین کی طرح پانی پر نہیں چل سکتا۔ کٹورا بھر پانی لشکر کو سیراب نہیں کر سکتا۔ ایک آدمی کی خوراک سینکڑوں انسانوں کو سیر نہیں کر سکتی۔ لیکن اس عام قانون فطرت کے خلاف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر معجزات دلیلِ صدق کے طور پر ظاہر ہوتے تھے۔ چنانچہ درخت اور پتھر ان سے ہم کلام ہوتے تھے۔ وہ پانی پر چل سکتے تھے۔ ان کی توجہ سے ایک آدمی کی خوراک سینکڑوں آدمیوں کو سیرابی بخشتی تھی۔ ایک کٹورا پانی سارے لشکر کی پیاس بُجھاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب انبیاء کا دعویٰ اس قدر بلند تھا تو اس کی دلیل بھی اسی قدر شاندار ہونی چاہیے تھی۔ اگر ان مقبولان بارگاہ ایزدی کو کوئی معجزہ نہ دیا جاتا اور وہ محض عقلی اور لفظی دلائل ہی سے کام لیتے تو عوام کے پاس حق و باطل کا کوئی قطعی اور فیصلہ کُن معیار نہ رہتا۔

انبیاء کی رُوحانی قوت کی اثر انگیزی:

پس ظاہر ہے کہ جو خدائے قدیر ایک دانہ اناج سے ہزار ہا دانے اور رتی بھر کے بیج سے تناور درخت اور قطرۂ آب سے انسان اور بہائم جیسی مخلوق پیدا کرتا ہے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کسی بے جان چیز میں جان ڈال دے یا جمادات اور بہائم کو قوتِ گویائی بخشے۔

جس طرح پانی آفتاب کی حرارت سے بہت دیر میں گرم ہوتا ہے لیکن آگ اسے تھوڑی سی دیر میں گرم کر دیتی ہے، اسی طرح جو اُمور فطرۃً بتدریج وقوع میں آتے ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام کی روحانی تاثیر سے فوراً عرصۂ وجود میں آجاتے تھے۔ مثلاً ایک بیج زمین میں پڑ کر دس سال میں ایک بڑا درخت بنتا ہے، پس ممکن ہے کہ ایک نبی کے ہاتھ پر وہی بیج آناً فاناً بڑا درخت بن جائے اور درمیان کے دہ سالہ وسائط کو چشم زدن میں مکمل کرلے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مرغی بہت دن تک انڈے سینے میں مصروف رہتی ہے، اس کے بعد کہیں تین ہفتوں میں بچے نکلتے ہیں۔ لیکن ایک مشین ایسی سُنی جاتی ہے جو انڈوں کو گھنٹہ بھر میں اتنی گرمی پہنچا کر بچے برآمد کر دیتی ہے کہ مرغی کو جس کے لئے بیس بائیس دن لگ جاتے ہیں۔

بہر حال معجزہ ان تمام انسانوں کے لئے جو نورِ عقل یا مجرد تبلیغ و دعوت سے ایمان اور ہدایت کی خوبیاں نہ جان سکتے تھے، دلیلِ دعویٰ کا کام دیتا تھا۔ پس جو حرماں نصیب معجزہ دیکھنے کے بعد بھی بدستور کُفر پر مصر رہے، اس کی علت جذباتِ بغض و عناد کی شدت یا فطری پست خیالی یا شقاوتِ ازلی کے سوا اور کچھ نہیں قرار دی جاسکتی۔

کیا معجزہ قانون فطرت کے خلاف ہے؟

معجزات اور خوارق عادات کے منکر کہتے ہیں کہ معجزہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس کا صدور ممتنع و محال ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فطرت کے تمام تر قوانین جن کے ماتحت معجزہ خلافِ فطرت سمجھا گیا، منضبط و متحقق ہو چکے ہیں؟ اہلِ تجربہ جانتے ہیں کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن ایک خاص مقدار میں ملائے جائیں تو پانی بن جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ پانی دو مختلف اجزاء سے مرکب ہے اور یہ حقیقت سائنس دانوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ لیکن جب تک اس کا عملی تجربہ نہیں کیا گیا تھا تمام حکماء دو ڈھائی ہزار سال سے پانی کو ایک مفرد عنصر یقین کرتے رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوانینِ فطرت تجربہ کے شرمندۂ احسان ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ کسی چیز کو خلافِ فطرت کہہ کر اس کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آفریندہ فطرت چاہے تو کبھی کبھی ان مسلمہ قوانینِ فطرت کو تبدیل بھی کر سکتا ہے۔

اور پھر جن اُمور کو آج خلافِ فطرت اور خارقِ عادت کہہ رہے ہو، ممکن ہے کہ کچھ مدت کے بعد وہی فعل تجربے میں آکر تمہارا مسلّمہ بن جائے۔ آج سے کچھ سال پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ ریڈیو کے ذریعے سے ایک شخص لندن یا نیویارک میں بیٹھا ہوا اپنی باتیں ہمیں اسی طرح سُنا سکتا ہے جس طرح کوئی پاس بیٹھا ہو۔ اسی طرح لاسلکی کی ایجاد سے پہلے یہ امر قطعاً بعید تھا کہ آپ کراچی میں بیٹھے ہوئے اپنے دوست کو لندن اور نیویارک میں ایک منٹ میں اپنے پیام دے سکتے ہیں۔ لیکن آج یہ چیزیں حقیقت ثابتہ ہیں۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جب کبھی کوئی نئی ایجاد ہوئی اور جدید تحقیق عالمِ وجود میں آئی تو خود سائنس دان ہی سب سے پہلے آستینیں چڑھا کر مخالفت کو کھڑے ہو گئے کہ یہ ناممکن ہے۔ آخر کچھ زمانہ کے بعد وہی ایجاد صحیح ثابت ہو کر ان کی فہرستِ مسلمات میں درج ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ جب خود سائنس کے متعلق ان کا یہ شیوہ رہا، تو رُوحانیت کی تو وہ جس قدر مخالفت کریں کم ہے، کیونکہ یہ اُمور ان کی سطحِ فہم و ادراک سے بہت بلند ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عقل وفہم کی میزان اتنی بڑی نہیں کہ اس پر ذات وصفاتِ خداوندی، حقیقتِ وحی و نبوت، معجزات اور اُمورِ آخرت جیسے ماوراء العقل مغیبات بھی وزن کیے جاسکیں۔ اصل مبحث یہ ہے کہ اگر ثقہ راویوں کی وساطت سے پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ فلاں نبی کے ہاتھ پر یہ معجزہ ظاہر ہوا تھا تو اس کے تسلیم کرنے میں شک وریب کو دخل نہ ہونا چاہیے، کیونکہ خالقِ فطرت ہی اس فطرت کو کبھی بدلنا چاہے تو وہ بدل سکتا ہے اور اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ قوانینِ الٰہیہ دو قسم پر ہیں۔ ''عام اور خاص''۔ معجزات عام قوانین سے مستثنیٰ اور خاص قوانینِ قدرت کے احاطہ میں داخل ہیں۔

معجزہ اور مسمریزم:

آزاد مشرب لوگ اور ابنائے تعلیمِ جدید جو اسلامی تعلیمات سے کہیں زیادہ یورپ کے الحاد و زندقہ سے وابستہ ہیں، معجزات کے وجود سے ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے لیکن مسمریزم کے تجربوں نے انبیاء علیہم السلام کے معجزوں اور ریاضت کش بزرگوں کے فوق الفطرت واقعات کی پوری طرح تصدیق وتوثیق کردی ہے۔ آج مسمریزم کا عامل ارواح پر ایسا تصرف کرتا ہے کہ اس کا معمول غیب کی خبریں سنانے لگتا ہے۔ عامل اپنے معمول کو بے ہوش کرکے اس سے جو کام لینا چاہے لے سکتا ہے۔ معمول مُردہ کی طرح بے حس ہوجاتا ہے اور اگر عامل اس اثر کو بروقت زائل نہ کردے تو بسا اوقات اس کے سازِ ہستی کا تار ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

''مسٹر ہڈسن'' نے کتاب 'لاء آف سائیکک فینا منا' میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جو خود اسکے ساتھ گزرا۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے ایک جرنیل کو رُوحانی طاقت کا کرشمہ دکھانے کے لئے ایک عاملہ عورت کے سامنے بٹھایا۔ جرنیل سے کہا گیا کہ وہ عاملہ سے مخفی رکھ کر اپنے ان احباب کے نام چھ چٹھیاں لکھے، جو بہت فاصلے پر ہوں۔ جرنیل نے وہ چٹھیاں لکھیں اور لپیٹ کر اپنے میز پر رکھ لیں۔ پھر عاملہ نے ان چٹھیوں کے قریب دو سلیٹیں ایک دوسرے کے اُوپر رکھ دیں۔ سلیٹوں کے بیچ میں ایک سلیٹ پنسل بھی رکھ دی گئی۔ اب جرنیل اور عاملہ نے اپنے اپنے ہاتھ اُن چٹھیوں اور سلیٹوں پر رکھ دیے۔ اس کے بعد یک بیک سلیٹوں کے اندر پنسل چلنے کی آواز سُنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہم نے تین خط کھینچنے کی آواز سُنی۔ عاملہ کہنے لگی کہ یہ تین خط اس بات کی علامت ہے کہ چٹھیوں کے جواب لکھے جاچکے۔ عاملہ نے سلیٹیں اُٹھا کر جرنیل کو دیں تو وہ اپنے دوستوں کے جواب پڑھنے لگا اور یہ دیکھ کر محوِ حیرت ہوا کہ ہر چٹھی کے وہی جواب درج تھے جو ہر ایک دوست کی طرف سے موزُوں ہوسکتے تھے۔

اس قسم کے بہت سے واقعات قلمبند کرنے کے بعد ہڈسن نے لکھا ہے کہ مہذب دُنیا ان واقعات کے صحیح ہونے کا ایسا ہی یقین رکھتی ہے جس طرح ہر انسان کو وجودِ آفتاب کا علم و یقین ہے۔ اس لئے آج جو شخص ان رُوحانی مناظر سے انکار کرتا ہے، وہ جاہلِ مطلق ہے یا اسے خللِ دماغ کا عارضہ ہے۔

مسمر کے قول و فعل پر ایمان:

مُلحدانِ تعلیمِ جدید اب بھی اس مرض میں بکثرت مبتلا ہیں کہ اگر انبیائے کرامؑ میں سے کسی کا کوئی معجزہ قرآن یا حدیث سے ان کے سامنے پیش کیا جائے تو ان کو سانپ سُونگھ جاتا ہے لیکن اگر مسمریزم کے موجد مسمر کا قول ان کے سامنے رکھا جائے تو **آمنا و صدقنا** کہہ کر سر جھکا دیتے ہیں، ایسے آوارہ مزاجوں کے بارہ میں کسی حق گو نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

اے کہ بر مائدہ یوروپ مہمان باشی — حیف باشد اگر از جملہ ایشاں باشی
حیف اگر از فلسفہ مغربیاں — منکر فلسفہ سُنت وقرآں باشی
مسمرار شعبدہ جلوہ دہد سرنہی — منکر معجزہ موسیٰ عمران باشی

معجزہ اور سحر کا فرق:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ سے جس قسم کے اعجوبہ روزگار اُمور صادر ہوتے ہیں، جادُو، طلسم، نیرنگ، شعبدہ، مسمریزم، ہپناٹزم وغیرہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اگر جادُو یا مسمریزم وغیرہ سے بھی معجزہ کے سے عجیب وغریب اُمور صادر ہوسکتے ہیں تو عامتہ الناس کے لئے حق وباطل میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

لیکن معجزہ اور سحر وغیرہ میں امتیاز کرنا نہایت آسان ہے۔ معجزہ اور سحر میں سب سے اہم اور اقدم امر خارق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام اعمال و کردار پاکیزہ، مقدس اور سراپا خیر ہوتے تھے، مگر ساحر اور اسی قماش کے دوسرے لوگوں کے افعال مذموم اور فتنہ پرور ہوتے ہیں۔ اور بغرض شرور وفتن عمل میں لائے جاتے ہیں۔ انبیاء کی استعانت صرف ذاتِ خداوندی سے ہوتی تھی، لیکن ساحر ماسوی اللہ سے مدد مانگتا ہے۔ پیغمبروں کا مطمع نظر رضائے الٰہی، تزکیۂ نفوس، ہدایت وفیض رسائی، خلق اور مخلوق کے تعلقات خالق سے استوار کرنا تھا۔ لیکن ساحروں کو لوگوں کی اصلاح اور تہذیبِ نفوس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ان باتوں کے نہ اہل ہیں اور نہ مدعی۔

ساحر اور مسمریزم کے عامل نیک کرداری اور عفت و طہارت کا کوئی ادنیٰ نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان کی حرکتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں کہ لوگوں میں خون خرابہ کرادیا، میاں بیوی میں جُدائی ڈال دی، طالب کو اُسکے مطلوب تک پہنچادیا، کسی کے دشمن کو ہلاک کردیا۔ الغرض ان کی تمام تر قوتِ سحر شر وزیان میں صرف ہوتی ہے۔ ساحروں اور اس قسم کے دوسرے شعبدہ بازوں سے اگر کوئی بڑی سی بڑی نیکی ظہور میں آسکتی ہے تو وہ کسی بیمار کو اچھا کرنا ہے۔ مگر یہ کبھی ممکن نہیں کہ فاسق سے اس کا فسق چُھڑادیں، دُنیا کے اندر کوئی روحانی انقلاب پیدا کردیں، زنگ آلود دِلوں کو جلادے سکیں، کیونکہ وہ تو بذاتِ خود پیکرِ شر اور مجسمۂ شیطنیت ہوتے ہیں۔

معجزہ اور سحر میں دوسرا فرق یہ ہے کہ معجزہ بے توسطِ اسباب محض اِرادۂ خداوندی سے صادر ہوتا تھا۔ سحر اور دوسرے عجائبِ اُمور میں وسائط کے غیر معروفہ مثلاً اسبابِ نفسی و طبعی وغیرہ کا واسطہ پایا جاتا ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ معجزہ کی غرض داعیِ حق کی تائید، اربابِ ایمان کی تسکین و تثبیت، اتمام حجت یا دعوۃِ الٰہی کے معاندین کی ہلاکت و تخریب ہوتی تھی، سحر کی طرح کھیل تماشہ اور شعبدہ بازی مقصود نہ ہوتا تھا۔

معجزہ اور سحر میں چوتھی حدِ فاصل یہ ہے کہ جب کبھی باہم دونوں کا مقابلہ ہوا تو معجزہ ہمیشہ غالب رہا اور سحر مغلوب ہوا۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ معجزے سے جو عظیم الشان خوارق و عجائب صادر ہوتے تھے مثلاً چاند کا شق ہونا، دریا میں خشک راستے پیدا ہوجانا وغیرہ یہ اُمور سحر کی رسائی اور قوتِ عمل سے باہر ہیں۔

چھٹا یہ ہے کہ معجزہ میں قلبِ حقیقت اور تبدیل خاصیت ہوتی تھی، سحر میں انقلابِ ماہیت نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف شعبدہ گری اور نیرنگ سازی ہے۔ کلامِ الٰہی کی متعدد آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ جادُو صرف فریبِ نظر یا چشم بندی اور شعبدہ بازی کا دوسرا نام ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

يُخَيَّلُ اِلَيّهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى

ترجمہ: ''موسیٰ علیہ السلام کو اُن کے جادُو کی نسبت یہ گمان ہوا کہ اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں۔''

اِنَّمَا صَنَعُوا كَيۡدُ سٰحِرٍ

ترجمہ: ''ان لوگوں نے جادُو کا کرتب کیا تھا۔''

سَحَرُوۡٓا اَعۡيُنَ النَّاسِ

ترجمہ: ''ساحروں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادُو کر دیا۔''

پہلی آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ صرف تخیّل تھا کوئی واقعی چیز نہ تھی۔ دوسری میں کید کا لفظ موجود ہے۔ یہ لفظ جب حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو تدبیر کے معنی میں آتا ہے اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جائے تو اس کے معنی عموماً فریب کے ہیں۔

تیسری آیت میں صاف موجود ہے کہ اُنہوں نے نظر بندی کی تھی۔

معجزہ اور سحر میں چھ قسم کے جو فرق اُوپر بتائے گئے ہیں ان میں سے بعض فرق ایسے ہیں جن سے معجزہ اور غیر معجزہ میں کوئی ظاہری اور غیر مشتبہ امتیاز نمایاں نہیں ہوسکتا اور ان سے التباس و اشتباہ کی حقیقی گرہ نہیں کھلتی۔ پس ان تمام اُمور میں سے سب سے بڑی مابہ الامتیاز چیز یہی ہے کہ اصحابِ خوارق کی اخلاقی اور عملی حالتوں کا باہم موازنہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں سے معصوم و پاک زندگی کس کی ہے، ناپاک کس کی، نیک کرداری اور حق پرستی کا علمبردار کون ہے۔ بدی اور شر کا کون؟ توحید اور شرائع الٰہی کا داعی کون ہے، کفر و ثنیت کا مصدر و منبع کون؟ کس کا اثرِ صحبت نیکی کی طرف مائل کرتا ہے اور کس کا فسق و معصیت کی طرف؟

معجزہ اور کرامات:

جو خرق عادات پیغمبر سے ظاہر ہو اسے معجزہ، آیت یا دلیلِ نبوت سے تعبیر کرتے ہیں اور ولی سے صادر ہو تو اسے کرامت کہتے ہیں، ولی وہ مومن ہے جو رب العالمین کی ذات و صفات کا علم حاصل کرنے کے بعد عبادات پر مواظبت کرے، گناہوں سے بچے، لذّات و شہواتِ نفسانی سے کنارہ کش رہ کر انقطاع و تبتل اختیار کرے اور جذبۂ شوقِ الٰہی اسے محبوبِ حقیقی کی طرف کھینچ لے۔ ولی نبی کا پیرو ہوتا ہے اسلئے اس کی کرامات بھی دراصل نبی ہی کا معجزہ ہے، جو صداقتِ نبی کی دلیل ہے۔ معجزہ میں دعویٰ نبوت ہوتا تھا، کرامت میں دعویٰ نہیں ہوتا۔ ہمارے آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کا یہ بھی ایک دائمی معجزہ ہے کہ آپ ﷺ کے کامل پیروؤں کے ہاتھ پر انقراضِ عالم تک خوارق عادت ظاہر ہوتے رہیں گے۔

بہت سے جہاں کرامت اور استدراج میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ وہ تارکانِ صلوٰۃ، بھنگ نوش، شراب خوار فاسقوں اور مبتدعینِ دہر کے شعبدے دیکھ کر اُنہیں ولیٔ کامل سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ اِتباعِ شریعت اور پیرویٔ سُنت کے بغیر کوئی انسان عارفانِ الٰہی اور خاصانِ بارگاہ کے زمرہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔

☆☆☆☆☆

﴿تبصرۂ کتب﴾

نام کتاب: حقوق البہائم

مصنف : مولانا اختیارُ الملک صاحب مدظلہٗ

قیمت :

ملنے کا پتہ : خانقاہ اشرفیہ گلشن چشتیہ۔ محلہ چٹی ڈھیری، شاہراہ ریشم، مانسہرہ۔

جناب بلال صاحب صاحبزادہ حضرت اختیارُ الملک صاحب کے ذریعے جناب اختیارُ الملک صاحب کی کتاب حقوق البہائم ملی۔ کتاب میں قرآن وحدیث اور بزرگوں کے آثار وکتب میں حیوانات کا جو تذکرہ آیا ہوا ہے جمع کر دیا گیا ہے کتاب کا مضمون انتہائی دلچسپ ہے۔ حیوانات کے تذکرے کے ضمن میں عجیب وغریب علوم ومعرفت کے نکتے بیان کیے گئے ہیں اس طرح یہ کتاب بیک وقت دلچسپی اور تفریحِ طبع کا سامان ہوتے ہوئے معرفت اور عبرت کا بھی خزینہ ہے۔ آدمی مطالعہ کرے تو مروجہ فضول ناولوں سے زیادہ پُر کشش ہے اور ساتھ ساتھ اصلاحِ باطن کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: اکابر دیوبند کی تواضع

مصنف : مفتی فدا محمد صاحب

جناب مفتی فدا محمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم عائشہؓ للبنات مینی کا مسودہ ''اکابر دیوبند کی تواضع'' بذریعہ جناب ڈاکٹر قیصر علی صاحب موصول ہوا۔ تصنیف وتالیف، تذکیر واشاعت دِین کا اہم ذریعہ ہے اور تصنیف کا سب سے زیادہ فائدہ خود مصنف کو ہوتا ہے۔ جتنا عرصہ مواد کی تحقیق میں لگتا ہے عبادت میں شمار ہوتا ہے، جتنا مالی خرچہ ہوتا ہے صدقۂ جاریہ میں شمار ہوتا ہے، کتاب اگر فقط ایک آدمی ہی پڑھ لے اور اثر لے لے تو ساری محنت اور خرچہ جگہ پر لگ کر انتہائی مفید ہو گیا، اور اگر کوئی ایک فرد بھی نہ پڑھے تب بھی یہ کتاب ایک مقبول عمل کی صورت میں پیش ہو جاتی ہے۔ کئی افراد کے مکاشفے اور رؤیائے صادقہ اس کے بارے میں ہیں کہ کتاب دربارِ رسالت میں پیش ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کا اظہار فرمایا۔ احادیث میں یہ بات واضح طور پر آئی ہے کہ اُمت کے اعمال جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتے ہیں۔ کتاب لکھنا اور شائع کرنا بھی ایک عمل ہے جس کے دربارِ رسالت میں پیش ہونے پر کوئی اشکال نہیں ہو سکتا۔

فی زمانہ ہماری یونیورسٹیوں میں ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے طلباء سے تحقیقی مقالے لکھوائے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ کم ہی چھاپ کر شائع کیے جاتے ہیں لیکن لکھنے والے کی علمی استعداد اور فہم میں خاطر خواہ اضافہ کرتے ہیں۔

تواضع خود ایک انتہائی اہم موضوع ہے اور اخلاقِ فاضلہ کی ایک صنف ہے بلکہ کبر کا زائل کرنا اور تواضع کا حاصل ہونا آدھا تصوف ہے، پھر اکابرین دیوبند جو علومِ ظاہری اور باطنی کے جامع گزرے ان کی زندگی میں تواضع کی عملی تمثیلیں موجود ہیں اور عملی مثالوں سے مشکل مضامین آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ کتاب پُر تاثیر ہے اور باطن پر واضح اثر ڈالتی ہے۔ اُمید ہے کہ اُردو کی اور خاص طور پر مذکر مؤنث کی اصلاح کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مفتی فدا محمد صاحب کی مساعی کو قبول فرما کر ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

(باقی صفحہ '۳۲' سے) شراب نوشی، سود خوری اور اعمالِ شرکیہ سے توبہ نہیں کریگی خوب یاد رکھو اس وقت تک عذابِ الٰہی سے نہیں بچ سکتی۔"

آپ ﷺ نے فرمایا: "تم مجھے ان باتوں کے ترک کر دینے کی ضمانت دو، میں تمھیں دُنیا و آخرت کی بھلائی کی ضمانت اور دُشمن پر غلبہ کی بشارت دیتا ہوں۔ لیکن اگر تم اب بھی ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو خوب یاد رکھو عنقریب ایک سخت ترین عذاب بصورتِ نفاق آنے والا ہے، جس سے تمھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔" (العیاذ باللہ۔ العیاذ باللہ)۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَاتَّقُوْ فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ج وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الانفال:۲۵)

ترجمہ: "اور تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص انہیں لوگوں پر واقع نہیں ہوگا جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔"

اس آیت کے سنتے ہی ہم سب پر گریہ طاری ہو گیا، ہم رو رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہ آیت دہرا رہے تھے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (النور: ۳۱)

ترجمہ: "اور اے مسلمانو! (تم سے جو ان احکام میں کوتاہی ہوگئی تو) تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو، تا کہ تم فلاح پاؤ۔"

﴿خواب اور پیغام﴾

یہ اقتباس ماہنامہ بینات کراچی کے شمارہ ربیع الاوّل ۱۳۹۲ھ (مئی ۱۹۷۲ء) میں حضرت مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے کالم ''بصائر وعبر'' سے لیا گیا ہے:

کچھ دِن ہوئے لاہور سے ایک صاحب کا گرامی نامہ موصول ہوا، ہم اس مکتوب اوراس کے ساتھ منسلکہ خواب کو بصائر وعبر کی مناسبت سے یہاں پیش کرتے ہیں۔

''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکان میں مشرق کی جانب رُخ کیے ہوئے ایک منبر پر تشریف فرما ہیں۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب کھڑا ہوں اور ایک دُبلے پتلے گورے چٹے بزرگ ان کی دائیں جانب کھڑے ہیں، علماء کا ایک گروہ بھی حاضرِ خدمت ہے، ایک عالمِ دِین کھڑے ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پاکستان کے حالات بیان کررہے ہیں، واقعات سناتے ہوئے جب وہ یہ کہتے ہیں: ''پھر یارسول اللہ! ہندوستان کی فوجیں فاتحانہ انداز سے ہمارے ملک میں داخل ہوگئیں۔'' تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی تھام لیتے ہیں اور آپ ﷺ کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ کر تمام محفل پر گریہ طاری ہوجاتا ہے اور بعض حضرات تو چیخیں مار مار کر رونے لگتے ہیں۔

کچھ دیر بعد آپ ﷺ علماء کی جماعت کی طرف متوجہ ہوکر ارشاد فرماتے ہیں: ''اس حادثۂ عظیم پر ملائکہ بھی غمزدہ ہیں، مگر ان کو تمہارے اعمال کی بدولت تمہاری مدد کے لیے نہیں بھیجا گیا۔'' پھر آپ ﷺ کا چہرۂ انور سرخ ہوگیا، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

''تمھیں معلوم ہے تمہاری اسی مملکت میں میری نبوت کا مذاق اُڑایا گیا، میرے صحابہ کو گالیاں دی گئیں، اور میری سنت کی تضحیک واہانت کی گئی۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے جماعتِ علماء! اُمت کو میرا یہ پیغام پہنچادو کی جب تک حکام عیاشی، ظلم اور تکبر نہیں چھوڑیں گے...... اغنیاء جب تک بخل، حق تلفی اور بے حیائی ترک نہیں کریں گے...... علماء جب تک کتمانِ حق، حرصِ دُنیا اور ریاکاری و خودنمائی سے باز نہیں آئیں گے...... عورتیں جب تک بدکاری، ناچ رنگ، فحش گانے، شوہروں کی نافرمانی اور عریانی و بے پردگی نہیں چھوڑیں گی اور...... پوری قوم جب تک جھوٹی گواہی، غیبت، زنا، لواطت، (باقی صفحہ '۳۱' پر)